ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

محبت وہمدردی کی اہمیت

’’انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر محبت کا مادہ ہے، اس کو حرکت دینے والی کوئی چیز مل جائے تو وہ حرکت میں آجاتا ہے، پھر نہ مذہب کو دیکھتا ہے، نہ ملت کو، نہ فرقہ کو، نہ علاقہ کو، نہ وطن کو اور نہ ملک کو، بلکہ انسان انسان کا دل دیکھتا ہے، اس کے درد کو محسوس کرتا ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور وہ کھنچنے پر مجبور ہے، اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے، اگر انسان سے یہ دولت چھن جائے تو وہ دیوالیہ ہو جائے گا، اگر ملک اس سے محروم ہو جائے، اگر امریکہ کی دولت، روس کا نظام، عرب ممالک کے پٹرول کے چشمے ہوں، ہن برستا ہو، سونے اور چاندی کی گنگا جمنا بہتی ہو، لیکن اس ملک میں محبت کا چشمہ خشک ہو چکا ہو، تو وہ ملک کنگال ہے، اس ملک پر اللہ کی رحمتیں نازل نہ ہوں گی۔‘‘

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

بنی نوع انساں پر محسن انسانیتؐ کے احسانات

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ

''محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے خوف کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ دنیا کے تمام پست و بلند اور نشیب و فراز کو برابر کیا، قوموں اور ذاتوں کا امتیاز اٹھا دیا، دولت' فقر' رنگ و روپ' نسل' قومیت کے نشانات مٹ گئے اور فخر و غرور اور جبر و ظلم کا بازار سرد پڑ گیا، سب انسان خدا کے بندے' سب اس کے سامنے برابر' سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بتایا کہ رات دن' آفتاب' ماہتاب' ستارے' جانور' دریا' آگ' درخت، غرض کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور وہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو اپنے خدمت گذاروں میں سے کسی کو اپنا معبود بنائے۔

انہوں نے اپنی وحی کے ذریعہ سے دنیا کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے، وہ خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی ہوا، یہ منصب نہ فرشتوں کو ملا' نہ آسمانوں کو' نہ زمینوں کو اور نہ پہاڑوں کو' قرآن مجید نے کہا کہ انسان بزرگیوں سے سرفراز' عالم مخلوقات میں سب سے برتر اور انعام و اکرام سے معزز ہے، اس میں بر و بحر پر چھا جانے کی قوت ہے، اس کی ہستی معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ مخلوق ہوئی ہے، وہ کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے، تو اب وہ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے؟

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھا کر صرف ایک خدا کے آستانہ پر جھکا دیا اور بتا دیا کہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے کام میں لگی ہوئی ہیں اور اسی کے لیے بنی ہیں، اب بتاؤ کہ وہ زمین کی کس ہستی کے سامنے اپنا سر جھکائے؟

دنیا نے انانیت کی اس بلند سطح' حقیقت شناسی کے اس اعلیٰ تخیل اور ادائے فرض کے اس قوی احساس تک جو ترقی کے قدم اٹھائے ہیں' ان کا مبداء اور دیباچہ بھی قرآنی تعلیمات تھیں، جنہوں نے انسان کی حقیقت اس پر آشکار کر کے اس کو خود شناس بنایا۔ ادائے فرض کی صورتیں سمجھائیں، افراد و اقوام کی شیرازہ بندی کی اور ان کو ایک سطح پر لا کر یک رنگی کا لطف پیدا کیا، یہی چیز تھی جس سے بکری اور اونٹ چرانے والے انسان' عالم کے گلہ بان بن گئے، ریت کے ذروں سے کھیلنے والے بدوی' سیم و زر اور تخت و تاج پر بازی لگانے لگے۔''

(علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند نادر خطبات و رسائل کا مجموعہ: ۴۹-۵۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۵ | رجب المرجب ۱۴۴۴ھ-فروری ۲۰۲۳ء | شمارہ: ۲

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

آسان دین

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا، وَأَبْشِرُوْا، وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(بے شک دین آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا، لہٰذا اپنے عمل میں پختگی پیدا کرو اور میانہ روی اختیار کرو اور خوش ہو جاؤ اور صبح و دوپہر اور شام اور کسی قدر رات میں (عبادت سے) مدد حاصل کرو۔)

(صحیح بخاری: ۳۹)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 | E-Mail: markazulimam@gmail.com | سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

جدید تعلیم کا بگاڑ (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

دینی تعلیم میں کوتاہی کا انجام.....۴

.....حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

انسانیت کا تقاضا.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

مسلمانوں میں ریزرویشن کی بنیاد کیا ہو؟.....۸

.....مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

علم اور اخلاق.....۱۰

.....مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

تقویٰ کیا ہے؟.....۱۱

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

نکاح کے چند مسائل.....۱۳

.....مفتی راشد حسین ندوی

محبت کی مستحق ذات.....۱۵

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک.....۱۷

.....محمد امین حسنی ندوی

مولانا علی میاں ندوی کا طرز تدریس.....۱۹

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

باوزن اوصاف

نتیجۂ فکر:- سید عبدالرب صوفی رحمۃ اللہ علیہ

وہ شے کیا ہے کہ گر وہ مل گئی تو مل گیا سب کچھ
وہ شے ہے ہر ضرورت کے لیے فوراً دعا کرنا

دعا میں دیر کی، امید غیر اللہ سے باندھی
یہ اشراک تصرف میں ہے دل کو مبتلا کرنا

عمل وہ کون ہے جو سب سے بڑھ کر ہے پسندیدہ
عمل وہ ہے نمازیں وقت پر پیہم ادا کرنا

وہ زیور کون زیور ہے جو ہے آنکھوں کی آرایش
جو آرایش ہے آنکھوں کی وہ زیور ہے حیا کرنا

وہ تین اوصاف یہ ہیں جن سے اپنا وزن بڑھتا ہے
تعصب چھوڑنا، سچ بولنا، وعدہ وفا کرنا

ثبوتِ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا" یہ ہے
طبائع پر بہت دشوار ہے جود وسخا کرنا

علامت جنتی ہونے کی ہے یہ بھی مسلماں کے
خدا کے خوف سے تنہائی میں آہ وبکا کرنا

تمامی عاقبت اندیشوں میں سب سے اعلیٰ ہے
جوانی میں مہیا دولت صدق وصفا کرنا

دعائے صوفیؔ ناچیز ہے اس نظم کے حق میں
مؤثر میرے ان اشعار کو میرے خدا کرنا

جدید تعلیم کا بگاڑ

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ایک زمانہ تھا کہ تعلیم انسان کی فلاح و بہبود کا ذریعہ تھی، اس سے انسانوں کو انسان بنایا جاتا تھا اور اس کو زندگی کا سلیقہ سکھایا جاتا تھا، تعلیم سے انسان کے اندر وہ بلند صفات پیدا ہوتی تھیں جن سے وہ بلند پایہ انسان بنتا تھا، اس کے اندر انسانیت کے جوہر پیدا ہوتے تھے، وہ دوسروں کے کام آتا تھا، لوگوں کو انسانیت سکھاتا تھا، ایثار و قربانی، اخلاق و محبت جیسی صفات سے وہ آراستہ ہوتا تھا، پھر اس دور میں ٹکنالوجی کا استعمال بھی صرف انسانی بہبود کے لیے ہوتا تھا، حاصل یہ ہے کہ علم اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

بغداد کے مشہور زمانہ اسپتال میں ہر طرح کی سہولتیں تھیں، جن کے لیے افراد تعینات تھے، مختلف امراض کے مریضوں کے لیے ایسے کھانوں کا باقاعدہ انتظام تھا جو ان کے لیے مفید ہوں اور آخری بات یہ ہے کہ کچھ لوگ صرف اس کام کے لیے ڈیوٹی پر رکھے گئے تھے جو مریضوں کی تسلی کا سامان کریں، وہ جا کر مریضوں سے ایسی بات کرتے تھے جس سے ان کو بڑا دلاسا ملتا تھا۔

آج علم، ٹکنالوجی کے میدان میں بہت آگے بڑھ گیا، لیکن اخلاق کے جوہر سے خالی ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے بجائے انسانی صفات رکھنے والوں کے جانوروں کی صفات رکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔

آج علم ایک بزنس بن کر رہ گیا ہے، انسان لاکھوں لاکھ روپیہ دے کر علم حاصل کرتا ہے اور فارغ ہو کر اسی کی وصول یابی میں پوری طرح لگ جاتا ہے اور اس میں وہ ہر طرح حدود کو پار کر گیا ہے، اگر اس نے کروڑوں روپیہ دے کر پڑھا ہے تو پہلے مرحلہ میں فارغ ہونے کے بعد اس کو وہ کروڑوں روپئے یاد آتے ہیں اور وہ ہر صورت میں اس کو سود بیاج کے ساتھ واپس لینا چاہتا ہے، ایک دور تھا کہ ڈاکٹر دلاسا دیتا تھا، آج ڈاکٹر کو دیئے ہوئے پیسے واپس لینے ہیں، وہ مریض سے آپریشن کی میز پر سودا کرتا ہے اور اس کی جان سے کھیلتا ہے اور مسئلہ صرف ڈاکٹروں کا نہیں، ان کی مثال تو صرف اس لیے پیش کی گئی کہ وہ سب سے بڑھ کر انسانوں کے مسیحا رہے ہیں، لیکن آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔

علم و اخلاق کے عدم توازن نے دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے، وہ اپنے فائدہ کے لیے نئے نئے ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے جان لینا بھی بڑی بات نہیں رہ گئی، انسانوں کی دنیا میں جانوروں کا طریقہ آج رائج ہو رہا ہے اور خود غرضی کا مزاج بنایا جا رہا ہے، جو انسانوں کو ہلاکت کے غار میں گرانے کے لیے تیار ہے، اگر لوگوں کا ذہن صحیح نہ کیا گیا اور ظلم و بربریت اور خود غرضی کا مزاج نہ بدلا گیا تو دنیا کا خدا ہی حافظ ہے۔

اس وقت جس طرح کرپشن بڑھتا جا رہا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں جس طرح رشوت خوری اور کام چوری بڑھتی جا رہی ہے، ذمہ داری کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے اور انسان صرف اپنا فائدہ دیکھتا ہے اور یہ چیز بڑھ کر اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ بیٹے کو باپ کا پاس ہے نہ باپ کے اندر بیٹے کی محبت ہے، اخلاق و روابط کو بھی بزنس بنا دیا گیا ہے، آدمی اگر ہنس کر بولتا بھی ہے تو ڈر لگتا ہے کہ وہ شاید اس کی بھی فیس وصول کر لے گا، کوئی کسی کے ساتھ محبت و اخلاق سے پیش آتا ہے تو اس کو بھی کچھ نہ کچھ حصولیابی کی امید ہو جاتی ہے self systom اس حد تک تجاوز کر گیا ہے کہ وہ خود غرضیوں کی انتہا کو پہنچ رہا ہے، یہ صرف اسی لیے ہے کہ علم اور اخلاق میں توازن نہیں رہا، شروع سے بچے کو تعلیم دی جاتی ہے تو اس کو خود غرضی سکھائی جاتی ہے، اخلاقی تعلیم تو پہلے لازم سمجھی جاتی تھی، اب برائے نام رہ گئی ہے اور اس کے لیے عملی تدابیر بالکل اختیار نہیں کی جاتیں، یہ علم و اخلاق کا عدم توازن ہے جس نے دنیا کو تباہی کے کنارے لا کر کھڑا کر دیا ہے، یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر مسلمانوں پر ہے کہ وہ دنیا کو اخلاق و محبت کا درس دیں اور نبی رحمت ﷺ کے دیے ہوئے دین رحمت سے دنیائے انسانیت کو روشناس کرائیں اور علم میں اخلاقی تعلیم کو اس طرح شیر و شکر کر دیں کہ وہ ایک خوبصورت گلدستہ بن کر سامنے آئے اور دنیا اس کی عطر بیز ہواؤں سے معطر ہو جائے۔

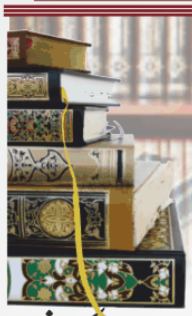

دینی تعلیم میں کوتاہی کا انجام

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾(آل عمران: ۲۰۰)

(اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوطی رکھو اور مورچوں پر جمے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ)

عربی میں ''صبر'' کے معنی ہیں: جم جانا، پختہ رہنا اور مقابلہ کرنا اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ چھوڑنا، اس کے بعد ہے: ''صابروا'' یعنی ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کا ماحول، اس کی فضا اور کیفیت پیدا کرو، جیسے کوئی بہت بڑا شامیانہ ہوتا ہے، اگر تھوڑے آدمی ہوں گے چھوٹا شامیانہ ہوگا، اگر کئی سو اور کئی ہزار ہوں گے تو بڑا شامیانہ ہوگا، اللہ تعالیٰ تلقین فرماتا ہے کہ صبر کا اتنا بڑا شامیانہ بناؤ کہ سب کے سروں پر وہ تنا ہوا ہو، پھر آخر میں فرماتا ہے: ''ورابطوا'' اپنے عقیدہ کی سرحدوں پر جمے رہو، کچھ ہو جائے، دنیا بدل جائے، حکومتیں بدل جائیں، سکہ اور زبان بدل جائے، طاقت بدل جائے، ہم اپنے عقیدہ سے جو اللہ کے رسولؐ نے اور سب پیغمبروں نے ہمیں عطا فرمایا ہے' ہم سرمو انحراف نہ کریں گے اور عقیدۂ توحید سے ذرہ برابر نہ ہٹیں گے کہ اس دنیا کا بنانے اور چلانے والا دونوں ایک ہے، تخلیق، حکم دینا اور انتظام کرنا اسی کا کام ہے، اللہ تعالیٰ ہی نے اس دنیا کو پیدا کیا اور وہی اس کا نظم ونسق چلاتا ہے۔

یہ دین جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے، اس کے لیے جہاں اور چیزیں ہیں وہیں تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق شرط ہے، ان سب کے ساتھ تھوڑا سا ارادہ اور تھوڑی سی نہیں بلکہ بہت زیادہ ہمت چاہیے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو جو پیغام ملا ہے اس کو ہم سینہ سے لگالیں گے اور اس کو اپنی زندگی کا مسئلہ بنالیں گے، جان جائے چلی جائے، لیکن ہم اپنے دین سے ہٹنے والے نہیں، اس نے پیغمبروں کے ذریعہ ہم کو جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کے سامنے دنیا کی تمام دولتیں اور تمام حکومتیں گرد ہیں، اس نعمت کو دانتوں سے پکڑلو اور آنکھوں میں اس کو بٹھاؤ اور دل میں جگہ دو، جس نے اس دین کی قدر کی تو اس نے گویا مضبوط کڑی کو تھام لیا: ''فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى''

ہر زمانہ کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، زمانہ کے امتحانات اور اس کی آزمائشیں بدلتی رہتی ہیں، اس کی ترغیبات، لالچیں، اس کی زبان، اس کا قانون حتی کہ نظام حکومت وسیاست میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، میں کسی ایک ملک اور کسی ایک زمانہ کو بھی نہیں کہتا، میرے سامنے تو پوری تاریخ ہے، کبھی ایسا بھی وقت آتا ہے جب اپنے دین پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے، دوسری طاقتیں اس کو اپنے سیاسی اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اور اپنی طاقت میں آنے اور اپنا سکہ چلانے اور ملک پر حکومت کرنے کے لیے یہ کوشش کرتی ہیں کہ مسلمان اپنے دین سے ہٹ جائیں، ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہماری دیو مالائی قبول کرلو اور کفر اور شرک کے متعلق اپنے رویہ میں تبدیلی کرلو، لیکن دین کا مطالبہ یہ ہے کہ جان چلی جائے مگر دین میں کتر وبیونت قبول نہ کریں، دین کی حفاظت میں اگر سیکڑوں اور ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں چلی جائیں اور عزتیں قربان ہو جائیں تب بھی کوئی پرواہ نہیں کہ اصل چیز جس سے قبر اور قیامت میں واسطہ پڑنے والا ہے، وہ یہی دین ہے وہاں تو یہ پوچھا جائے گا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے اور یہ حضور گون ہیں؟ قبر میں یہ کام نہیں آئے گا کہ آپ فلاں کے بیٹے ہیں اور ایم اے پاس ہیں، کسی میونسپلٹی یا ریاست وحکومت کے گورنر اور حاکم ہیں، جس طرح آپ ٹرین میں بغیر ٹکٹ سوار ہو جائیں اور ٹکٹ کلکٹر ٹکٹ مانگے تو آپ یہ

کہیں گے کہ ہمارے پاس اچھی گھڑی ہے اور اچھا ساز وسامان ہے، ہم فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں، لیکن آپ کے اس جواب سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، وہاں تو ٹکٹ کا سوال ہوگا، یہی حال اس طالب علم کا ہوتا ہے جو امتحان میں پرچہ کا صحیح صحیح جواب دیتا ہے تو کامیاب ہوجاتا ہے، قبر کا بھی یہی حال ہے، جہاں اپنا دین اور اپنا ایمان کام آتا ہے، اس دنیا کا بھی یہی حال ہے، اللہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ ہمارے دین پر کتنا قائم ہے اور اس کے لیے کس نے کتنی قربانیاں دی ہیں اور کتنی مضبوطی اور استقلال کا ثبوت دیا ہے۔

تو سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ صبر وضبط سے کام لو، اپنے دین پر مضبوطی سے جمے رہو، دوسروں کو بھی تھامے اور جمائے رکھو اور ان کو صبر کی تلقین وترغیب دو، یہ اس طرح حاصل ہوگا کہ پہلے خود علم دین حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی دین کا علم دیں اور اس کی فکر کریں کہ ان کا عقیدہ ٹھیک ہے یا نہیں، یہ اللہ اور اس کے رسول کو پہچانتے ہیں کہ نہیں، یہ نہیں کہ بچوں کی ترقی وخوش حالی اور دولت مند گھرانوں میں ان کی شادی کردی جائے، اس کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں اگر آپ نے اپنے بچوں کو دین کی تعلیم نہیں دی۔ اس لیے بنیادی کام یہ ہے کہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں اور اس کی راہ میں کچھ قربانی دینی پڑے، کچھ خطرہ مول لینا پڑے، لیکن ہمت سے کام لو اور اپنے بچوں' گھر والوں پھر محلّہ والوں اور اس سے بڑھ کر گاؤں والوں اور قرب وجوار کے لوگوں کو گھوم پھر کر دین کی تعلیم دو کہ جو نعمت اور دولت اللہ نے آپ کو عطا کی ہے اور جتنا دین آپ جانتے ہیں وہ دوسروں کو بھی بتایئے، اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن مجید اور اردو پڑھے بغیر بچوں کو رہنے نہ دیجیے، چاہے لوگ آپ کو دھمکائیں اور کہیں کہ یہ کیا کھائیں گے، کیا کمائیں گے، ان کو آج کل کی زبان پڑھایئے، آج کل کا کورس پڑھایئے، اسکول بھیجئے، لیکن نہیں! خدا کے یہاں آپ کا دامن ہوگا اور ان کا ہاتھ ہوگا اور ہمیں تو ڈر ہے کہ کہیں خدا کا دست قدرت اور دست غضب نہ ہو اور آپ کا دامن نہ ہو کہ کیا پڑھایا تھا اپنے بچوں کو اور کیا سکھایا تھا ان کو؟

آپ یاد رکھئے کہ دینی تعلیم کے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کا رہنا ممکن نہیں ہے، دنیا میں جو چیزیں اثر ڈالتی ہیں اور ان کے جو نتائج ہوتے ہیں، تعلیمی طاقت، لسانی طاقت، ادبی طاقت، قانونی طاقت اور حکومتی طاقت کے اثرات اور نتائج ہم نے دیکھے ہیں لیکن دینی تعلیم کے بغیر ملت اسلامیہ امت اسلامیہ بن کر ہندوستان میں نہیں رہ سکتی، اس لیے ہر قیمت پر اپنے بچوں کو جغرافیہ پڑھایئے، تاریخ اور ادب پڑھایئے، سائنس اور حساب پڑھایئے، لیکن پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ دین کی بھی تعلیم دیجیے، مسجد مسجد اور گھر گھر اس کا انتظام ہونا چاہیے، اس تعلیم کو خوب چلایئے، اگر دین کی تعلیم کو آپ پھیلایئے گا نہیں، اس کو دبا کر بکس میں بند کر کے رکھئے گا، تو پھر اس کے لیے خطرہ پیدا ہوجائے گا کہ کہیں سے کوئی ڈاکو آکر اس پر ڈاکہ ڈال دے لیکن اگر آپ نے اپنے آس پاس کے ماحول کو صحیح رکھا، دوسروں کو بھی اس دولت میں شریک کریں گے تو دوسرے بھی اس کو عزیز رکھیں گے اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔

اب جو زمانہ ہے وہ نیا زمانہ ہے، اس میں نئے انتخابات ہوں گے، نئی حکومت بنے گی اور جو لوگ حکومت بنا سکتے ہیں وہ قانون بھی بنا سکتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو نئے خطرات اور نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا اور دوسروں کو بھی صبر واستقامت کی تلقین اور ترغیب دینی ہوگی، اگر ہم نے اخلاص واستقامت کا ثبوت دیا اور خدا کو حاضر وناظر سمجھ کر سارے کام کیے تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی، لیکن اگر مسلمانوں نے دینی تعلیم کے معاملہ میں کوتاہی کی تو مسلمان مسلمان بن کر اس ملک میں نہیں رہ سکتے، کسی اور چیز کا خطرہ ہم نہیں بتاتے، کھانے کو بھی ملتا رہے گا، جانوروں کو بھی ملتا ہے، غیر مسلم بھی آپ سے اچھا کھاتے ہیں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کے یہاں آپ مسلمان نہیں سمجھے جائیں گے اور اسلام اور مسلمانوں کے دفتر میں آپ کا نام نہیں لکھا جائے گا۔

انسانیت کا تقاضا

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اس دنیا میں اتارا اور ان کو دنیا میں زندگی گذارنے کا راستہ بتایا اور حکم دیا کہ زندگی گزارنے کا جو اصل طریقہ ہے تم کو اس پر عمل کرنا ہے، لیکن ان کے بعد اس اصل طریقہ سے لوگ بھٹکتے رہے، اس لیے کہ آدمی کے وسائل محدود ہوتے ہیں اور خواہشات زیادہ ہوتی ہیں، جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان خواہشات کے دباؤ سے صحیح راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور صحیح راستہ وہ انسانی راستہ ہے جو اللہ نے انبیاء کو بتایا ہے، ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا:

"یا أیها الناس! ان ربکم واحد وان أباکم واحد، ألا! لا فضل لعربي علی عجمي ولا لعجمي علی عربي ولا لأحمر علی أسود ولا أسود علی أحمر الا بالتقوی" (اے لوگو! بے شک تمہارا پالنہار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، صاف سن لو! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اسی طرح کسی سرخ کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے سوائے تقوی کے!) (بیہقی: ۵۱۳۷)

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"الناس بنو آدم وآدم من تراب" (سنن الترمذی: ٤٣٣٧) (تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔)

اس حدیث سے تمام انسانیت کو یہ پیغام دے دیا گیا کہ ہر ایک کو اپنی حیثیت سمجھنا چاہیے، یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ وہ بہت حقیر چیز سے بنایا گیا ہے اور وہ اچھا اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اچھا طریقہ اختیار کرے، لیکن اگر وہ مٹی ہی میں رہنا پسند کرتا ہے تو ظاہر ہے وہ بری حالت میں رہے گا اور مٹی کی جو حالت ہے وہی حالت اس کی ہوجائے گی، یعنی ذلت اور رسوائی کی حالت ہوجائے گی، لیکن اگر وہ اس مٹی سے نکلنا چاہتا ہے تو اس کو بلند اخلاق اختیار کرنا ہوں گے اور یہ راز قرآن مجید میں بھی بتادیا گیا ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور پھر تم کو بہت اچھی باتیں اور اچھا طریقہ بتادیا ہے، ان کے ذریعہ تمہارے لیے یہ ممکن ہے کہ تم مٹی سے اونچے ہوجاؤ، مٹی سے نکل کر بلند ہوجاؤ، لیکن اگر تم اس سے نہیں نکلو گے اور خود کو بلند کرنے کی کوشش نہیں کروگے تو تم خوار اور رسوا ہوگے، جیسے مٹی رسوا ہوتی ہے اور خاک اڑتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ایک اصول کے طور پر یہ بات بیان فرمادی کہ جب ہم انسان کی حیثیت سے زندگی گذاریں گے تو ہم مٹی سے بلند ہوں گے، ورنہ پھر ہم مٹی ہی کے زمرہ میں رہیں گے، جس طرح جانور ہوتے ہیں کہ ان کو مٹی سے نکلنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، نہ مٹی سے نکلنے کا راستہ ان کو بتایا گیا ہے، وہ مٹی میں ہی رہتے ہیں اور اسی میں چر لیتے ہیں، البتہ انسان اس سے بلند ہے اور اس کو بلندی حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تم سب آدم کی اولاد ہو تو ایک دوسرے کے بھائی ہو، لہٰذا ایک دوسرے کی فکر بھی رکھو اور تم میں بہتر صرف وہی ہے جو "تقوی" اختیار کرے۔

"تقوی" عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ عربی کے لفظ "وقی-یقی-وقایة" سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں: اپنے کو بری باتوں سے بچانا، اپنے کو خطرہ سے بچانا، اپنے کو بری جگہ یا بری چیز سے بچانا، یہ سب مفہوم اس میں شامل ہیں، اسلامی اصطلاح میں ہم "تقوی" کا جو لفظ بولتے ہیں، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اپنے کو بری باتوں سے بچاؤ، اپنے کو غلط باتوں سے بچاؤ اور وہ غلط باتیں کون سی ہیں؟ وہ بھی ہم کو بتایا گیا ہے کہ غلط باتیں فلاں فلاں ہیں، لہٰذا جو شخص بھی ان باتوں سے احتیاط کرے گا اور اپنے کو ان غلط باتوں سے بچائے گا، اس کو اچھا اور اونچا درجہ دیا جائے گا اور وہ ایک بہتر انسان شمار ہوگا، اسی طرح جو شخص اپنے کو بری باتوں سے نہیں بچائے گا، وہ بہتر انسان نہیں ہوسکتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہم سب انسان ہیں اور حضور

ﷺ کا فرمان عالی یہ ہے کہ عرب ہو یا عجم، کالا ہو یا گورا آپس میں تمام انسان ایک ہی ہیں اور سب بھائی بھائی ہیں، اس لیے کہ سب آدم کی اولاد ہیں، یعنی ایک باپ کی اولاد ہیں، تو کیوں نہ سب لوگ اس مقام پر آنے کی کوشش کریں جس پر آج اکٹھا ہونے کی سخت ضرورت ہے، جو مقام ہم کو سکھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہم میں سے ہر انسان دوسرے انسان کو اپنا بھائی سمجھے، جب ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھے گا، تو ہر ایک دوسرے سے قریب ہوگا، اس کے فائدہ کو اپنا فائدہ سمجھے گا، جیسے بھائی بھائی کو سمجھتا ہے، وہ اس کے فائدہ کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے، قرآن و حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں، اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ وہی رویہ اختیار کریں جو بھائی بھائی کے ساتھ کرتا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی برا ہو، لیکن بری بات کو برا سمجھتا ہے، جھوٹ بولنے والا کتنا ہی جھوٹ بولے، لیکن اگر اس سے یہ معلوم کیا جائے کہ جھوٹ اچھی چیز ہے یا بری چیز ہے؟ تو یقیناً وہ یہی کہے گا کہ جھوٹ بری چیز ہے، اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی کو کتنی ہی تکلیف پہنچاتا ہو اور بڑا ظالم ہو، لیکن اگر اس سے پوچھا جائے اور اس کی صحیح رائے لی جائے کہ ظلم کیسی چیز ہے؟ تو وہ بھی یہی کہے گا کہ ظلم بری چیز ہے، اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں یہ ایک احساس رکھا ہے کہ وہ برے کو برا سمجھتا ہے اور اچھے کو اچھا سمجھتا ہے۔

انسانی مزاج کا عمومی جائزہ لینے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جب تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور برے اچھے کو سمجھتے بھی ہیں، تو ہم سب کو اسی حساب سے ہر ایک سے معاملہ کرنا چاہیے، ہم سوسائٹی کے ہر فرد کے ساتھ حسن سلوک کریں، وہ سوسائٹی خواہ ایک مذہب کی ہو یا متعدد مذاہب کی ہو، ہم کو یہ طے کرنا ہے کہ ہم بحیثیت انسان کے آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کریں گے، ایک دوسرے کی تکلیف کو دور کرنے کی فکر کریں گے، جیسے اپنی تکلیف دور کرتے ہیں، اپنے بھائی کی تکلیف دور کرتے ہیں اور اپنے پڑوسی کی تکلیف دور کرتے ہیں، خود قرآن مجید میں بھی ان باتوں کا حکم ہے کہ تم اپنے پڑوسی کا خیال کرو اور اپنے عزیز کا خیال کرو، لہٰذا سوسائٹی میں اگر کوئی ہمارا رشتہ دار ہے تو ہم رشتہ داری کے ناطے اس کا خیال کریں گے، اگر کوئی ہمارا پڑوسی ہے تو پڑوسی کے لحاظ سے اس کا خیال کریں گے اور اس سلسلہ میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہمارا مذہب کوئی روک لگائے گا، کیونکہ جب انسانی سطح پر کچھ کرنا ہو تو اس میں مذہب نہیں دیکھا جاتا ہے، جب آپ ایک ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں تو اس میں مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے کی ممانعت ہرگز نہیں ہے، بلکہ سلوک کرنا مستحسن ہے، بالخصوص جب کوئی سوسائٹی مشترک مذاہب اور مشترک خیالات کی حامل ہو، تو ایسی صورت میں ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہوتا ہے، اس لیے کہ جب سوسائٹی میں مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ماننے والے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے زیادہ دیکھتے ہیں، ایسے وقت میں ہماری ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ ہم زیادہ اخلاق برتیں، تاکہ یہ جو دوری ہے، یہ دوری انسانی سطح پر دور ہو جائے، چونکہ ہم ایک انسان ہیں، اس لیے ہمارے اندر اخلاق ہیں، ہمارے اندر حسن سیرت ہے، ہمارے اندر ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ ہے، ہمارے اندر دوسرے کے لیے محبت ہے، یہ انسان کی حیثیت سے ہماری صفت اور ہمارا طرز و طریقہ ہونا چاہیے، جب ہم انسان ہیں تو ہم کو انسانی صفات، انسانی اخلاق اور انسانی سیرت اختیار کرنی چاہیے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی مختلف طبقات ہیں، مختلف مذاہب ہیں اور مختلف نسلیں ہیں، اس لیے یہاں اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ ہم سب آپس میں واقعی بھائی بھائی معلوم ہوں اور آپس میں ایسا اتحاد پیدا ہو جو انسانی اتحاد کہلائے، نہ کہ سیاسی اتحاد، اس لیے کہ سیاست تو مصلحتوں سے چلتی ہے، لیکن انسانی اخلاق اور انسانیت اس طرح نہیں چلتی کہ ہم صرف اپنی مصلحت دیکھیں، بلکہ اس میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی کی طرح رہیں۔

مسلمانوں میں ریزرویشن کی بنیاد کیا ہو؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اسلام سے پہلے دنیا میں جو مذاہب موجود تھے، ان میں انسانوں کے ایک گروہ کو نسلی بنیاد پر دوسرے انسانوں پر افضل قرار دیا جاتا تھا، ایرانی آریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو تمام انسانوں کا مخدوم اور پیدائشی طور پر حکمرانی کا اہل تصور کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز تصور بھی پایا جاتا تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کا تصور تھا کہ وہ چونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے ہیں، اس لیے انہیں پوری انسانیت پر فضیلت حاصل ہے اور وہ خدا کے قریبی لوگ ہیں، آریوں ہی کا قافلہ ایران سے ہندوستان آیا اور رفتہ رفتہ طبقاتی تقسیم اور گہری ہوتی گئی، چنانچہ یہاں انہوں نے وہ قانون مرتب کیا جسے ''منو'' کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس میں انسانیت کو مستقل طور پر چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

ایک گروہ کے بارے میں کہا گیا کہ یہ خدا کے سر سے پیدا کیے گئے ہیں، یہ پیدائشی طور پر مقدس اور امتیازی شان کے حامل ہیں، عام لوگوں کا کام ہے کہ ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز پیش کریں اور ان کو راضی رکھیں، اسی میں لوگوں کی نجات ہے، بادشاہوں کو بھی اس گروہ کے تابع رکھا گیا، یہ گروہ برہمنوں کا ہے۔ دوسرا گروہ ویش کا ہے، جو خدا کے بازوؤں سے پیدا کیے گئے ہیں، ان کا کام کاروبار حکومت کو چلانا ہے، تیسرا گروہ چھتریوں کا ہے، جو ان کے عقیدہ کے مطابق خدا کی رانوں سے پیدا کیے گئے ہیں، محنت و مزدوری کرنا ان کی ڈیوٹی ہے۔ چوتھا گروہ شودر کا ہے، جن کے بارے میں ان کا تصور ہے کہ یہ خدا کے پاؤں سے پیدا کیے گئے ہیں، ان تینوں گروہوں کا بنیادی کام برہمنوں کی خدمت کرنا اور ان کو خوش رکھنا ہے، لیکن خود ان تینوں طبقوں کے درمیان درجات و مراتب میں بڑا تفاوت ہے، شودر تو جانوروں سے بھی بدتر ہیں، ان پر علم کا دروازہ بند ہے، ان کا سایہ بھی اس لائق نہیں ہے کہ اونچی ذات والوں پر پڑ سکے، اونچی ذات والوں کے مندروں کے دروازے ان پر بند ہیں، عام طور پر دراوڑ ہندوستان کے اصل باشندے تھے، وہ بے چارے اس حقیر سلوک کے مستحق قرار دیے گئے اور انہیں شمالی ہند بلکہ پورے ملک سے کھدیڑ کر جنوبی ہند کی آخری ساحلی پٹی میں مقیم ہونا پڑا جو اس زمانہ میں شہری سہولتوں اور تہذیب و ثقافت کی کرنوں سے دور کا علاقہ تھا۔

ہندوستان کے لوگوں میں صدیوں اس تصور کی تبلیغ کی گئی کہ نیچ سمجھے جانے والے لوگ خود بھی اس حیثیت پر قانع ہو گئے، اس سوچ کو مزید پختہ کرنے اور مظلوم شودروں کو احتجاج سے روکنے کے لیے برہمنوں نے آواگون کا تصور دیا، یعنی انسان اپنے اعمال کے اعتبار سے دنیا میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے، اس طرح شودروں کو بتایا گیا کہ تمہارا شودر ہونا بلا سبب نہیں ہے، یہ پچھلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے، اگر اس جنم میں تمہارے اعمال اچھے رہے اور تم نے برہمنوں کی خدمت کا حق ادا کیا تو تم اگلا جنم ایک برہمن کی صورت میں لے سکتے ہو، یہ وہ تصور تھا جس نے نیچ سمجھے جانے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا، اس غیر انسانی تصور کو چونکہ مذہبی رنگ دے دیا گیا، اس لیے اس کی جڑیں اتنی گہری ہو گئیں کہ متعدد اصلاحی کوششوں کے باوجود آج پڑھے لکھے لوگوں میں بھی یہ سوچ موجود ہے اور عملاً برہمنوں اور اونچی ذات والوں کی فرمانروائی کا سکہ چل رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو جو انقلابی تصورات دیے، ان میں ایک وحدتِ انسانیت کا تصور بھی ہے، قرآن نے صاف اعلان کر دیا کہ تمام انسان ایک ہی شخص کی اولاد ہیں، انسانوں کا کوئی گروہ نہ خدا کی اولاد ہے اور نہ پیدائشی طور پر خدا کو زیادہ محبوب ہے، خدا کے نزدیک نسلی بنیادوں پر کوئی اونچا اور نیچا نہیں ہے، بلکہ انسان کے باعزت ہونے کا معیار ان کا عمل اور برتاؤ ہے۔

اس تصور سے انسانی مساوات کی فکر کو تقویت پہنچتی ہے، جن لوگوں نے انسانوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا تھا، انہوں نے انسانوں کے ایک گروہ کو خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ بنادیا تھا اور تصور دیا تھا کہ ہر عام وخاص کی خدا تک رسائی نہیں ہوسکتی، اسی لیے مسلمانوں میں پڑوسی قوموں سے تعصب کی وجہ سے کبھی کبھی علاقائی، لسانی اور نسلی تعصب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، لیکن چونکہ یہ اس امت کے بنیادی عقیدہ اور اساسی فکر کے خلاف ہے، اس لیے اس کو مسلمانوں میں کبھی بھی دوام واستمرار حاصل نہیں ہوا اور نہ امت کے دین دار طبقہ نے کبھی اسے قبول کیا۔

اس وقت ملک اسی صورت حال سے گذر رہا ہے، برادران وطن میں ذات پات کی چنگاری سلگ رہی ہے اور شعلہ بننے کو تیار ہے، دوسری طرف مسلمانوں میں پسماندہ ذات اور اونچی ذات وغیرہ کا راگ الاپا جارہا ہے، تاکہ اس تصور سے سیاسی فائدہ اٹھایا جائے، ہوسکتا ہے کہ سیاسی فائدہ کے لیے کچھ مسلمانوں کو پسماندہ طبقہ قرار دے کر انہیں فائدہ پہنچا دیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے مفید سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگا۔

عرصہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبہ رہا ہے کہ انہیں تعلیم، ملازمت اور سیاسی نمائندگی میں ریزرویشن دیا جائے، تاکہ وہ موجودہ پسماندگی سے باہر آسکیں اور یقیناً یہ حکومت کی ذمہ داری ہے، اس لیے کہ یہ پسماندگی مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی تنگ نظری اور ناانصافی کا نتیجہ ہے اور حکومت کو خود اپنی ناانصافی کی تلافی کرنی چاہیے، اس ریزرویشن کی بنیاد معاشی پچھڑا پن ہونا چاہیے نہ کہ ذات پات، اس لیے اسلام میں قبائل وخاندان اونچ نیچ کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ خاندان تعارف وپہچان کے لیے ہے، جیسے انسان الگ الگ صورتوں سے پہچانا جاتا ہے، الگ الگ ناموں سے اس کی شناخت ہوتی ہے، مختلف مقامات اور شہروں کی نسبت سے لوگوں کی سکونت کا علم ہوتا ہے، اسی طرح اپنے مورثِ اعلیٰ کی نسبت سے بھی انسان کی شناخت ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اولاً تو یہ تقسیم خلاف واقعہ ہے، ہندو سماج سے متاثر ہونے کے باوجود آج بھی مسلمان معاشرہ میں ذات پات کی جڑیں اتنی گہری نہیں ہیں، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو محض خاندان کی نسبت سے حقیر نہیں سمجھتا، ایسا نہیں ہے کہ بعض مسجدیں سادات وشیوخ کے لیے مخصوص ہوں اور دوسروں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہو، ایسا نہیں کہ کوئی انصاری اور نداف امام ہو تو مغل اور پٹھان ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کردیں، ایسا نہیں ہے کہ خانقاہوں میں اصلاح ومشیخت کے منصب پر صرف سادات وشیوخ ہی فائز ہیں۔

دوسرے جب کوئی عمل مسلسل ہونے لگتا ہے تو وہ عقیدہ بن جاتا ہے، اس لیے اگر ذات پات کی بنیاد پر ریزرویشن دیا گیا تو یہ ابتداءً تو ایک سیاسی عمل ہوگا، لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کے دل بھی تقسیم ہوجائیں گے، ان کی سوچ بھی بدل جائے گی اور مسلمانوں میں بھی برادران وطن کی طرح ذات پات کی گہری تقسیم خدانخواستہ پیدا ہوجائے گی، اب غور کیجیے جو دین اس طبقاتی تصور کو مٹانے کے لیے آیا اور جس نے انسانی وحدت کا تصور دیا، اسی دین کی حامل امت اپنے آپ کو اونچے نیچے طبقات میں تقسیم کرلے، اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی بات ہوسکتی ہے؟

خود جن مسلمان خاندانوں کو حکومت پست طبقہ قرار دیتی ہے اور اس بنیاد پر ان کو کچھ رعایت دینا چاہتی ہے، وہ سوچیں کہ کیا ان کو اپنے لیے یہ بات پسند ہے کہ انہیں کمتر اور رذیل تصور کیا جائے اور اس بنیاد پر کچھ ملازمتوں کی بھیک دے دی جائے؟ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آئندہ نسلوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ برادران وطن میں جو لوگ دلت کہلاتے ہیں، ان کے اندر اپنی کمتری کا احساس اس درجہ راسخ ہوچکا ہے کہ نکالے نہیں نکلتا، اگر آج مسلمانوں کے کچھ خاندانوں کو پسماندہ ذات قرار دے دیا گیا تو پچاس سو سال کے بعد ان کی آنے والی نسلیں بھی ایسے ہی احساس کمتری میں مبتلا ہوجائیں گی، اس لیے مسلمانوں کو متفقہ طور پر اس بات کا مطالبہ کرنا چاہیے کہ انہیں معاشی بنیاد پر ریزرویشن دیا جائے نہ کہ ذات پات کی بنیاد پر!

علم اور اخلاق

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو اسلام بنی نوع انسانی کے درمیان رنگ ونسل، ذات برادری اور حسب ونسب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتا اور تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کرتا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "یا أیها الناس إن ربکم واحد وإن أباکم واحد، لا فضل لعربي علی عجمي، ولا لعجمي علی عربي، ولا لأحمر علی أسود ولا لأسود علی أحمر إلا بالتقوی" (اے انسانو! تمہارا رب ایک اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ ہی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے سوائے تقوی کی بنیاد پر) وہی اسلام علم کی بنیاد پر انسان انسان کے درمیان تفریق کرتا ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۹) (کہہ دیجیے کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟ نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "فضل العالم علی العابد کفضلي علی أدناکم" (عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جس طرح میری فضیلت تمہارے ادنیٰ ترین آدمی پر ہے۔) (ترمذی)

دوسری طرف اسلام اس علم کے حصول پر زور دیتا ہے جو معرفت خداوندی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق کا جوہر پیدا کرے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم: ٤) (بیشک آپ تو اخلاق کی بلندی پر فائز ہیں) اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: "کان خلقه القرآن" (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تو قرآنی ہیں۔) (بخاری)

علم اور اخلاق ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، یہ دو رخ جب ملتے ہیں تب سکہ بنتا ہے، جیسے پرندے کے دو پر ہوتے ہیں، ایک پر کاٹ دیا جائے تو صرف ایک پر سے وہ فضا میں نہیں اڑ سکتا ہے، بلکہ زمین پر گر پڑے گا اور کسی بلی یا کتے کا شکار بن جائے گا، علم ایک چراغ کی طرح ہے اور اخلاق اس کی روشنی، چراغ کی قیمت اس کی روشنی سے ہوتی ہے، علم کی مثال ایک پھل دار درخت کی ہے، علم درخت ہے جبکہ اخلاق اور پھل اس کے پتے ہیں کیونکہ درخت کی کوئی قیمت نہیں جب تک کہ اس میں پتوں کی خوبصورتی نہ ہو اور اس کے پھلوں میں مٹھاس نہ ہو، جبکہ پتے اور درخت کے بغیر پھلوں کا کوئی وجود نہیں۔

اگر عالم اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف نہ ہو تو وہ ترقی کے راستوں کو مسدود دیکھے گا، چاہے اس کا علم بڑا وسیع ہو، جب تک وہ علم اور اخلاق سے اپنے آپ کو مزین نہ کرلے، نہ ہی وہ آگے بڑھ سکتا ہے، نہ ہی ترقی کرسکتا ہے اور نہ ہی وہ بلندی حاصل کرسکتا ہے، علم اگر اخلاق اور عزت سے خالی ہوجائے اور رب کے نام سے اپنے آپ کو وابستہ نہ رکھے تو ایسا علم تباہی اور گمراہی، تشدد اور دہشت گردی کا باعث بنتا ہے، جیسا کہ بہت سے ممالک میں ہو رہا ہے، جو ممالک ان جوہری ہتھیاروں سے بالکل تباہ وبرباد ہوگئے، جن کو انسان نے صرف اپنے علم ومطالعہ اور تجربات کی روشنی میں حاصل کیا تھا، لیکن اگر یہی علم اخلاق، شرافت اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ حاصل کیا جاتا تو یہ اسلحے اور یہ علم تخریب کاری اور بگاڑ میں استعمال نہ ہوتے اور نہ ہی ہم کو لاشوں اور جسم کے چیتھڑے اور سروں کے ڈھیر نظر آتے جو اخلاق سے عاری علم کا شکار بن گئے۔

جو کچھ بے حیائی، عریانیت، فحاشی اور ہم جنس پرستی کے مناظر سامنے آرہے ہیں اور گھروں پر سایہ کی طرح منڈلا رہے ہیں، انہیں تباہ وبرباد کررہے ہیں، خاندانوں کو توڑ رہے ہیں، ان سب کے پیچھے یہی ذرائع اور یہی جدید ٹیکنالوجی ہے جس پر انسان نے اپنے علم اور عقل سے قبضہ کرلیا ہے اور جس کا استعمال افواہوں اور جھوٹی خبروں کو پھیلانے میں کیا ہے، نہ کہ اچھی باتوں اور اخلاق حسنہ کو پھیلانے کے لیے اور شرعی تقاضوں کو پورا کرنے اور دینی قانون کو نافذ کرنے کے لیے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ علم اور اخلاق کو جمع کیا جائے، کیونکہ اگر پرندہ ایک پر سے اڑے گا تو اس کا انجام سب جانتے ہیں۔

(**ترجمانی**: محمد امین حسنی ندوی)

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ:

مسلمانوں کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے اصل کتاب وسنت ہے اور ہمارے سامنے جو راستہ ہے وہ صرف اللہ کے نبی ﷺ کی سیرت کا راستہ ہے اور اس کی جو تفصیلات ہمارے سامنے ہیں، وہ تفصیلات حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی بتائی ہوئی ہیں پھر انہی تفصیلات کو حضرات اولیائے کرام رحمہم اللہ اور اپنے وقت کے ائمہ وعلماء نے ایسا کھول کھول کر اپنی زندگی اور اپنے زبان وقلم سے بیان کیا ہے کہ آدمی اگر اس کو دیکھے تو اس کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی یہ سمجھتا ہے کہ سب سے زیادہ میں ہی جانتا ہوں تو خطرہ ہے کہ کہیں وہ بھٹکتا نہ چلا جائے۔

تقویٰ کا مزاج بنانے کے لیے ذکر بہت ضروری ہے اور ذکر کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی اللہ والوں کی صحبت اختیار کرے، تاکہ اس کا دل روشن ہوجائے اور جب دل روشن ہوتا ہے اور اللہ کا دھیان پیدا ہوتا ہے تو پھر آدمی غلطیوں سے بچتا ہے اور برائی اور گندگی سے اپنے آپ کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تقویٰ کے مراحل:

تقویٰ ایمان والوں کے لیے ایک بنیادی صفت ہے اور ہمیں اس کا حکم ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ۱۰۲) (اے ایمان والو! اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جیسے اس سے ڈرنا چاہیے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

تقویٰ اختیار کرنے میں سب سے بنیادی مرحلہ شرک سے بچنا ہے، آدمی شرک اور اس کی آمیزش سے بچے اور اس کی ان تمام باتوں سے بچے جن میں ادنیٰ قسم کا بھی شرک کا شائبہ محسوس ہوتا ہو۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ پھر وہ اللہ کی معصیت اور گناہوں سے بچے، بطور خاص بڑے بڑے گناہوں سے بچے۔ تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ آدمی مکروہات سے بچے اور آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ دل کے اندر ایسا آجائے کہ غیر اللہ نکل جائے، خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا شعر ہے ع

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

یہ شعر اسی حقیقت کی ترجمانی ہے، بلاشبہ اللہ کی ذات اتنی غیرت مند ہے کہ جب تک دل کے اندر غیروں کو بسایا جائے گا اور غیروں کی محبتیں پالی جائیں گی، اس وقت تک اللہ کی محبت دل میں داخل نہیں ہوسکتی، تقویٰ مکمل جب ہوگا اور اللہ کا لحاظ پوری طرح جب ہی پیدا ہوگا، جب آدمی ہر طرح کا تقویٰ اختیار کرے، وہ شرک سے بچے، معصیت سے بچے اور مشتبہات ومکروہات سے بچے، یہاں تک کہ غیر اللہ سے بھی بچے اور اس کا دل اللہ کی یاد میں ایسا مست ہوجائے، وہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے ایسا فارغ کردے کہ پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے، یہ اصل تقویٰ کی شان ہے اور یہ تقویٰ کا اعلیٰ ترین معیار ہے، جو معیار اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبیوں کو دیا، جن سے بڑھ کر لوگ نہ پیدا ہوئے اور نہ قیامت تک ہوں گے اور ان کے سردار سرکار دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ نے اسی تقویٰ کا اعلیٰ ترین معیار عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا بنایا کہ نبوت سے پہلے بھی آپ کو اللہ نے ہر غلط کام اور ہر طرح کی معصیت سے بچایا، ہر طرح کے مکروہات سے بچایا، سیرت میں بعض واقعات ایسے ملتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ

ﷺ کے ہم جولی کسی جگہ شادی کے جشن میں لے گئے، جہاں خرافات ہورہی تھیں، تو وہاں پہنچتے ہی عجیب بات یہ ہوئی کہ آپ ﷺ کو نیند آگئی اور آپ ایسا سوئے کہ جب وہ سارا تماشا ختم ہوگیا تب آپ ﷺ کی آنکھ کھلی۔

حفاظت الٰہی:

اللہ تبارک وتعالیٰ جب اپنے کسی خاص بندہ کو بچانا چاہتا ہے تو اسی طرح بچاتا ہے، آپ ﷺ کی شان تو ایسی بلند ہے کہ اس کا کوئی تصور نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ آپ ﷺ کے جو غلام صحابہ تھے اور ان غلاموں کے غلام جو اولیاء تھے، ان کے واقعات بھی اگر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کیسے بچاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اولیاء اللہ تو غلاموں کے غلام ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے راستے پر چلنے والوں کو بھی وہ روشنی اور وہ حس عطا فرمادیتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ کا ایسا فضل خاص ہوتا ہے کہ اللہ ان کو بچاتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ یقیناً اللہ کے ایک مقرب بندہ اور ولی تھے اور اللہ کے نبی ﷺ کے غلاموں کے غلام تھے، ان کا واقعہ ہے کہ آپ بہت چھوٹے تھے، تقریباً دوڈھائی سال کی عمر ہوگی، تو آپ کی کھلائی تکیہ سے آپ کو شہر لے جارہی تھی، شہر کے بعض خاندانی اعزہ سے ملوانے کے لیے، شہر جانے کے راستہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں لوہانی پور پڑتا ہے، وہاں کسی کے تیجے یا چالیسویں کا کھانا ہورہا تھا، جب وہ کھلائی وہاں سے گذری تو لوگوں کے اصرار پر اس کھانے میں بھی شریک ہوگئی، وہ بے چاری غریب تھی، اس لیے کھانے کو بیٹھ گئی، مگر اس کا بیان ہے کہ علی میاں بچہ تھے اور بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ عجیب وغریب جملہ کہلوایا کہ بیٹا! یہ کھانا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے اور اس نے پھر آپ کو وہ کھانا کھانے بھی نہیں دیا، وہ کہتی ہے کہ ہم نے ایک لقمہ بھی نہیں کھانے دیا۔ معلوم ہوا حضرت مولانا کے ساتھ اللہ کا فضل خاص شامل حال تھا، اس لیے اللہ نے ایسے کھانے سے بھی محفوظ رکھا۔

تقویٰ کے اہتمام کا فائدہ:

واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان تقویٰ کا اہتمام کرے تو یہ اہتمام نسلوں میں جاری رہتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ بچوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ تقویٰ کے لیے اکل حلال کا اہتمام بھی انتہائی ضروری ہے، اگر اکل حلال کا اہتمام کیا جائے تو خاندانوں میں برکتیں پیدا ہوتی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نسلوں میں دین منتقل کرتا ہے، لیکن اگر حلال وحرام کا فرق نہ ہو اور آدمی کا مطمح نظر بس یہ ہو کہ مال آنا چاہیے، خواہ مشتبہ ہو یا کچھ بھی ہو، تو ایسا مزاج تقویٰ کے بالکل برعکس ہے، پھر کبھی بھی تقویٰ کا مزاج نہیں بن سکتا۔

تقویٰ کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ آدمی اپنی تربیت کرے، اپنا مزاج بنانے کی کوشش کرے اور بالخصوص اکل حلال کا غیر معمولی اہتمام کرے، اگر یہ مزاج بن جائے گا تو اس کے ذریعہ سے انشاء اللہ تقویٰ کا بھی مزاج بنے گا۔

حاصل بحث:

تقویٰ کے مختلف درجات کا حصول یکبارگی ممکن نہیں، البتہ جب آدمی محنت کرتا رہے گا تو ایک زینہ، دوسرا زینہ اور تیسرا زینہ کرکے آگے بڑھتا چلا جائے گا اور چڑھتا چلا جائے گا، پھر کیا بعید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو نیابتِ انبیاء عطا فرمائے اور اولیائے کرام کا وہ مقام عطا فرمائے، جنہوں نے پوری دنیا کو ایمان ویقین سے بھردیا اور اللہ نے ان کے ذریعہ سے بڑا کام لیا۔ لیکن یہ جب ہی ممکن ہے جب آدمی اس کے لیے تیاری کرے، شروع سے محنت کرے، اس کے اندر عزم ہو، وہ اپنی خود تربیت کرے، اپنی اچھائیوں اور برائیوں بھلائیوں کو دیکھے اور سوچے اور اگر ذرا بھی شبہ ہو تو اپنے بڑوں سے پوچھے اور اگر بڑے کسی بارے میں کہہ دیں کہ تمہارا یہ کام غلط ہے تو چاہے اس کا دل یہی کہتا ہو کہ ہم صحیح ہیں، لیکن اس کو اس وقت یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ہم غلط ہیں، کیونکہ ہمیں اپنے رہنما کی بات ماننا ہے، جب آدمی اس طرح اپنی تربیت کرے گا تو یقیناً تقویٰ کا مزاج بنے گا۔

نکاح کے چند مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

نکاح میں کفاء ت:

کفاءت کے لفظی معنی مماثلت کے ہوتے ہیں:"کافأ: اذا ساوی"(المعجم الوسیط) اورشریعت کی اصطلاح میں کفاءت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب عورت کی شادی کی جارہی ہوتو چند امور میں شوہراس کے برابر کا ہو یا اس سے افضل ہو۔ (شامی:۲/۳۴۴)

جہاں تک مرد کا تعلق ہے تو اس کی شادی کرتے وقت لڑکی کا اس کے مساوی ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس سے کم تر یا افضل بھی ہوسکتی ہے،اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فقہی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ عورت کو یا اس کے گھر والوں کو اس سے تکلیف ہوسکتی ہے کہ وہ کسی (دنیا کے طرف کے لحاظ سے) گھٹیا کا فراش بنے،لیکن مرد فراش بناتا ہے،لہٰذا اس میں اس طرح کی کسی بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔
(شامی:۲/۳۴۴)

کیا اسلام میں بھی اونچ نیچ کا تصور ھے؟

اس مسئلہ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ کیا بعض مذاہب مثلاً ہندوؤں کی طرح اسلام میں بھی ادنیٰ اعلیٰ اور اونچ نیچ کا تصور ہے؟ حاشا وکلا! اسلام اس اونچ نیچ کے تصور سے بہت بلند ہے،قرآن مجید میں صاف اعلان کیا جاچکا ہے کہ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف جماعتوں اور قبائل میں صرف اس مقصد سے تقسیم کردیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تقویٰ میں تم میں سب سے بڑھا ہوا ہو:﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

(الحجرات: ۱۳)

اور نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ایام تشریق کے درمیان لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:''لوگو! سنو! تمہارا رب ایک ہے،تمہارا باپ (یعنی جدامجد حضرت آدمؑ) ایک ہے،سنو! نہ تو کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے، نہ کسی گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر سوائے اس کے کہ تقویٰ ہو'' (مسند احمد:۲۳۴۸۹)

لہٰذا فضیلت ہرگز ان امور سے حاصل نہیں ہوسکتی جن کو کفاءت کا معیار قرار دیا گیا ہے، البتہ شادی اور ازدواجی تعلق چند روز نہیں بلکہ زندگی بھر کے لیے ہوتا ہے اور جن امور کو معیار کفاءت قرار دیا گیا ہے ان کے نہ ہونے پر نکاح کی پائیداری پر حرف آسکتا ہے، اسی لیے ان کو نکاح کی شرط کے طور پر نہیں بلکہ اولیاء اور لڑکی کے حق کے طور پر کفاءت کا معیار قرار دیا گیا ہے، اسی لیے اولیاء اور گھر والے بے جوڑ رشتہ پر راضی ہوں تو ان کے درمیان بلا تکلف رشتہ ہوسکتا ہے،اسی لیے آنحضور ﷺ کے عہد مبارک میں بے جوڑ شادیوں کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں، بلکہ بعض فقہاء کے یہاں تو کفاءت کا سرے سے اعتبار ہی نہیں ہے، بعض کے یہاں صرف دین داری پر اعتبار ہے، بقیہ امور میں نہیں ہے،اس تفصیل سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام میں کفاءت کے اعتبار کا ہندوؤں کے یہاں اونچ نیچ کے ظالمانہ فلسفہ سے دور دور سے بھی کوئی واسطہ نہیں، ہاں بہت سے مسلمانوں میں ہندوؤں کے زہریلے اثرات سے اس طرح کے غیر اسلامی خیالات ضرور پیدا ہوگئے ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد ہم ان چند امور کو بیان کرتے ہیں جن میں احناف کے نزدیک کفاءت کا اعتبار کیا جاتا ہے:

کفاء ت کا اعتبار کن چیزوں میں ھوگا؟

فقہاء احناف کے یہاں مندرجہ ذیل چیزوں میں کفاءت کا اعتبار کیا جائے گا: (۱) نسب (۲) حریت (۳) قبول اسلام میں سبقت (۴) دین داری (۵) مال داری (۶) پیشہ۔

اب ہم ذیل میں ان چھ امور کی مختصر وضاحت کرتے ہیں:

نسب میں کفاء ت:

فقہی کتابوں میں صراحت سے لکھا ہوا ہے کہ نسب میں کفاءت

کا اعتبار صرف عربی خاندانوں میں کیا جائے گا اور بقیہ لوگوں میں نہیں کیا جائے گا اور پھر عرب خاندانوں میں جتنے خاندانوں کا تعلق قریش سے ہے وہ سب ایک دوسرے کے کفو ہیں، اس طرح اگر لڑکی سید ہو تو قریش کے دوسرے خاندان صدیقی فاروقی اور عثمانی کا لڑکا اس کا کفو قرار دیا جائے گا، جہاں تک دوسرے عرب قبائل کا تعلق ہے تو وہ قریش کے کفو نہیں ہیں، لیکن سب ہی قریش کو چھوڑ کر بقیہ قبائل کے کفو ہیں۔ (ہندیہ:۱/۲۹)

عجمی برادریوں میں کفاءت:

اوپر بیان کیا گیا کہ غیر عرب لوگوں میں نسب کے اعتبار سے کفاءت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، لیکن کفاءت کا مسئلہ چونکہ رشتہ نکاح کو پائیدار رکھنے کے مقصد سے ہے، لہٰذا اگر عرف میں اہل عجم بھی جن برادریوں کو اپنے برابر کا سمجھتے ہوں، شرعاً ان کو برابر کا مانا جائے گا اور جن کو برابر کا نہ مانتے ہوں، ان کو کفو نہیں قرار دیا جائے گا۔
(شامی:۲/۳۴۹)

حریت میں کفاءت:

یہ حکم اس وقت تھا جب کہ غلامی پائی جاتی تھی، اسی لیے اس کے متعلق کتابوں میں تفصیلات درج ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ اب غلامی دنیا سے ختم ہو چکی ہے، لہٰذا اس کی تفصیلات بیان کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جدید الاسلام اور قدیم الاسلام ہونے میں کفاءت

کتابوں میں لکھا ہے کہ نو مسلم شخص پہلے سے آبائی مسلمان لڑکی کا کفو نہیں ہے اور تفصیلات کرتے ہوئے بتایا گیا کہ جس کی دو پشتیں مسلمان ہوں وہ قدیم الاسلام ہے، لہٰذا وہ ایسی لڑکی کا بھی کفو مانا جائے گا جس کی اسلام پر کئی پشتیں گذر چکی ہوں اور جو شخص خود مسلمان ہوا یا جس کا باپ مسلمان ہوا، دادا غیر مسلم تھا، تو یہ شخص جدید الاسلام کہلائے گا اور یہ قدیم الاسلام خاتون کا کفو نہیں ہو سکتا اور یہ تفصیلات وہاں کے لیے ہیں جہاں قدیم الاسلام اور جدید الاسلام ہونے کو شرف وامتیاز کا معیار بنایا جاتا ہو، جہاں ایسا نہ ہو وہاں اس کو کفاءت میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ (ہندیہ:۱/۲۹۰، شامی:۲/۳۴۶)

اسی لیے ہندوستان کے علماء اور مفتیان کرام کی اجتماعی تجویز میں ہے: ”کوئی بھی غیر مسلم اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلم سوسائٹی کا معزز فرد بن جاتا ہے، اسے پشتینی مسلمانوں کے برابر حقوق واحترام حاصل ہو جاتا ہے، مسلمان لڑکیوں کا نکاح اگر نو مسلم نوجوانوں سے کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ جائز ہوگا، بلکہ موجب اجر وثواب ہے۔“ (فقہ اکیڈمی کے فیصلے:۹۹-۱۰۰)

دین داری اور مال داری میں کفاءت:

اگر لڑکی دین دار ہو اور لڑکا شرابی کبابی تارک صلاۃ ہو تو وہ اس لڑکی کا کفو نہیں ہے اور اگر اولیاء چاہیں تو قاضی کے یہاں نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔ (ہندیہ:۱/۲۹۱)

جہاں تک مال داری میں کفاءت کا تعلق ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لڑکا مال داری میں لڑکی کے برابر ہو، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ لڑکی کے مہر اور نفقہ کی ادائیگی پر قادر ہو۔
(ہندیہ:۱/۲۹۱)

پیشہ میں کفاءت:

شریعت میں پیشہ کے اعتبار سے اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لیے اس میں کفاءت صرف اسی صورت میں معتبر ہوگی، جب لڑکی دوسرے پیشہ والوں کے یہاں رشتہ ہونے کو پسند نہ کرے، یعنی اس کا اعتبار کلی طور پر عرف پر ہے۔ (شامی:۲/۳۴۹)

اصل مسئلہ عرف پر مبنی ہے:

”مسئلہ کفاءت میں دین داری کا اعتبار تو ضروری ہے، دیگر امور ایسے ہیں جن کا تعلق عرف وعادت اور سماجی حالات سے ہے، اس لیے پوری دنیا اور تمام ممالک اور اقوام کے لیے امور کفاءت کی تعیین اور تحدید یکساں نہیں ہو سکتی، لہٰذا ہر ملک وعلاقہ کے علماء وفقہاء وہاں کے عرف وعادات اور سماجی احوال کے پیش نظر امور کفاءت کی تحدید وتعیین کریں گے، بغیر اس کے کہ کفاءت کو آپس میں عزت وذلت وشرافت اور ذلالت کے ساتھ جوڑا جائے۔“
(فقہ اکیڈمی کے فیصلے:۱۰۰)

محبت کی مستحق ذات

عبدالسبحان ناخداندوی

انسانوں کو سب سے بڑھ کر محبت اللہ رب العزت سے ہونا چاہیے، ایسی محبت جو بندگی اور عبادت کی حد تک پہنچ جائے، اس طرح کی محبت اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے، انسان کے دل میں یہ محبت احسان اور کمال کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا اپنی قدرت اور رحمت کی نشانیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن لوگوں کو اپنے خود ساختہ معبود اتنے پسند آتے ہیں کہ وہ محبت میں اللہ رب العزت کی جگہ لیتے ہیں، اللہ کی محبت کہیں پیچھے چلی جاتی ہے، حالانکہ خود ان کے بقول یہ معبودان باطلہ اللہ سے قریب کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، پھر بھی ذرائع اصل پر غالب آجاتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ براہ راست اللہ کا تذکرہ بھی ان کو ناگوار گذرتا ہے اور معبودان باطل کے تذکرہ سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں، قرآن کریم نے کتنی سچی منظر کشی کی ہے:

﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ (جب ایک اللہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو ان لوگوں کے دل سکڑنے لگتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جب اللہ کے علاوہ اور معبودوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں)

اللہ سے محبت اس کی الوہیت، ربوبیت، خلاقیت، اس کے فضل وکمال، اس کے احکام واحسان کا نتیجہ ہوتی ہے، وہ بالذات محبوب ہے، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اس درجہ محبت کے قابل نہیں۔ لیکن معبودان باطلہ کی محبت' ان کی الوہیت اور ربوبیت کا سبب بنتی ہے اور فی نفسہ محبت کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شرک کی اصل وجہ بے وجہ محبت ہے، سب سے پہلے انسان بے دلیل اعتقاد گڑھتا ہے، پھر محبت میں اندھا بہرا ہوکر اس کی عبادت کرتا ہے، یہ عبادت بھی اللہ کے قرب کے دعوے پر ہوتی ہے، پھر یہی محبت اللہ سے دوری کا ذریعہ بنتی ہے، یہاں تک کہ اللہ کا تذکرہ بھی پسند نہیں آتا۔

دنیا کی بہت ساری قومیں ایسی ہیں جو فائدہ پہنچانے والی ہر مخلوق کو جو درحقیقت اللہ کے احسان کا ایک نمونہ ہوتی ہے، براہ راست خدا کا درجہ دے ڈالتی ہے، چاند سورج اللہ کی مخلوق ہے، آسمان زمین اللہ کے پیدا کردہ ہیں، بر وبحر کو جود بخشنے والا اللہ ہے، درخت پہاڑ سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، ان میں موجود نفع کی صلاحیت اہل باطل کے نزدیک ان سے محبت پھر ان کی عبادت کا ذریعہ بنتی ہے، آگے ان کے لیے کچھ مثالی صورتیں تیار کی جاتی ہیں، ان صورتوں میں سرے سے کوئی نافعیت نہیں ہوتی، لیکن ان سے ایسی محبت کی جاتی ہے جو شاید نفع پہنچانے والی اشیاء سے بھی نہ کی جائے، اللہ کا معاملہ تو سب سے آخر میں ہے، اسے کون یاد رکھتا ہے، ان تمام محبتوں کی بنیاد انسانی حماقت وجہالت ہے کہ انسان مخلوق اور مصنوع تک رہتا ہے، صانع اور خالق تک نہیں پہنچ پاتا پھر اس مخلوق ومصنوع کی مثالی صورتوں میں اٹک کر رہ جاتا ہے کہ بس جہاں کوئی صورت بن گئی اس کا دماغ چل جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم اس قوم سے تعلق رکھتے تھے جو صنم پرستی کی ڈسی ہوئی تھی، وہ خوب جانتے تھے کہ جب مورتیں اور مجسمے وجود میں آتے ہیں تو انسان کے دماغ کتنے خراب ہوجاتے ہیں، اسی لیے جب وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے شرک جیسی لعنت ونحوست سے پناہ چاہتے ہیں تو بالخصوص بتوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ اے

پروردگار! ان بتوں نے بہت ساروں کو گمراہ کر دیا:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِناً وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ☆ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ﴾

(اس وقت کو یاد رکھو جب ابراہیم نے کہا: پروردگار! اس شہر کو امن والا بنادے، مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے محفوظ رکھ، پروردگار! ان بتوں نے بہت سارے انسانوں کو گمراہ کیا ہے)

شاید اسی وجہ سے اس امت توحید کے لیے جاندار کی تصویر بنانا بھی سخت ترین حرام قرار دیا گیا ہو۔ واللہ اعلم!

یہ بات واضح رہے کہ اللہ نے فطری طور پر انسان میں محبت کا جذبہ رکھا ہے، اپنے محسنین اور تعلق رکھنے والوں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، اسلام دین فطرت ہے، اس لیے ایسی کسی محبت سے وہ منع نہیں کرتا، بلکہ وہ ہر انسان سے محبت اور اس کے حق کو ادا کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے، البتہ آخری درجہ کی محبت تنہا اللہ کے لیے خاص ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ وضاحت کے ساتھ ارشاد ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُواْ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّـهِ جَمِيعاً وَأَنَّ اللَّـهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ﴾ (البقرة: ۱۶۵) (اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر مدمقابل ٹھہراتے ہیں، ان سے وہ ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت کی جاتی ہے، جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب یہ عذاب کو دیکھیں گے (تو جان جائیں گے) کہ تمام قوتیں اللہ کی ہیں اور اللہ کا عذاب نہایت سخت ہے)

یہ وہ محبت ہے جو بندگی اور غلامی تک پہنچاتی ہے اور محبوب کے لیے جان و مال اور عزت و آبرو سب کچھ قربان کرنے کا حکم دیتی ہے، ایسی محبت صرف اللہ کے لیے ہوسکتی ہے، اس محبت میں کسی کو شریک کرنا جائز نہیں ہے بلکہ شرک ہے۔

آیت میں ارشاد ہے کہ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُواْ أَشَدُّ حُبّاً لِّلَّهِ﴾ (جو لوگ ایمان والے ہیں وہ تو اللہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں) یہ جملہ خبر بھی ہے اور حکم بھی، یعنی اہل ایمان ایسا کرتے ہیں اور ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اللہ سے شدید محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔

معبودان باطلہ بے جان پتھر اور بے حس مورتیں کسی سے کیا خاک محبت کریں گی، خالص مادی نقطہ نگاہ سے بھی غور کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ محبت طاقتور ہستی سے کرنی چاہیے، جو خود ایسا بودا پھس پھسا کمزور و بے جان قسم کا ہو کہ اپنی حفاظت آپ نہ کر سکے اس سے محبت کرنے سے کیا حاصل، لیکن بعض لوگ ان سے اللہ سے محبت کرنے کی طرح محبت کرتے ہیں، یعنی قلب و دماغ، عقل و فراست کے لحاظ سے اندھے بہرے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ساری قوتیں تنہا اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہیں، لہٰذا ساری محبتیں بھی اسی کے لیے وقف ہونی چاہیے۔

آیت کے اخیر ٹکڑے میں ارشاد ہے:

''اور اگر ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب وہ عذاب کا مشاہدہ کریں گے تو ان کی سمجھ میں خوب آجائے گا کہ تمام تر قوت اللہ کی ہے اور اسی کا عذاب سب سے بڑھ کر سخت ہے۔''

معلوم ہوا ابھی عذاب کا وقت نہیں آیا ہے، اسی لیے خدا سے بیزار لوگ بغلیں بجا رہے ہیں، جب اصل وقت آجائے گا تب ان کا کچومر نکل جائے گا، یعنی اصل پورا عذاب دیکھنا بھی ضروری نہیں بلکہ جب عذاب کا وقت آجائے اور یہ عذاب کی ابتداء بھی دیکھ لیں گے تو ان کو احساس ہوگا کہ بازی ان کے ہاتھ سے نکل چکی ہے، طاقت اللہ کی ہے، اب ذلت آمیز عذاب ان کا مقدر ہے۔

یہ کیفیت موت کے وقت ہوگی یا پھر قیامت کے دن، یا جس وقت اللہ ہلاکت کا فیصلہ کرے اس وقت بھی ہوسکتی ہے۔

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک

محمد امین حسنی ندوی

انسان کا سب سے مضبوط اور انمول رشتہ اگر کسی سے ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں، یہ رشتہ ہے محبت کا، عقیدت کا، احترام کا، تقدس کا، عظمت کا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً☆وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً﴾ (الاسراء: ۲۳-۲۴) (اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو، بلکہ ان سے عزت کے ساتھ بات کیا کرو اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنے آپ کو انکساری سے جھکاؤ اور یہ دعا کرو یا رب! جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھے پالا ہے آپ بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجیے۔)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح اپنے ساتھ والدین کا تذکرہ فرمایا ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ والدین کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ماں باپ کے ساتھ اولاد کا جو سلوک ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ﴾ (لقمان: ۱۴) (اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے بارے میں تاکید کی ہے (کیونکہ) اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری برداشت کرکے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تم میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرو اور یہ بات سمجھ لو کہ لوٹ کر میرے پاس ہی آنا ہے۔)

والدین ہی ہیں جنہوں نے پوری پوری رات جاگ کر اولاد کی خواہشوں کو پورا کیا، اس کے آنسوؤں کو پونچھا، اس کی معمولی تکلیف پر تڑپ گئے، بے چین ہوگئے، والدین ہی ہیں جو اپنی اولاد کو اپنے سے زیادہ چاہتے ہیں، اس پر اپنی جان نچھاور کرتے ہیں، خود بھوکے رہتے ہیں تاکہ ان کے بیٹے کا پیٹ بھر جائے، خود جاگتے ہیں تاکہ وہ آرام سے سو جائے، خود تھکتے ہیں تاکہ وہ آرام سے رہ سکے، وہ محبت کرتے ہیں لیکن بیٹا نفرت کرتا ہے، وہ عزت کے ساتھ رکھتے ہیں لیکن یہ اہانت وتذلیل کا معاملہ کرتا ہے، جب یہ گھر سے نکلتا ہے تو وہ بے چین رہتے ہیں کہ خیریت سے گھر واپس آجائے، پریشان رہتے ہیں تاکہ اس کو سفر میں کسی بھی طرح کی کوئی تکلیف یا پریشانی نہ ہو، ایک پل کے لیے چین سے نہیں بیٹھ پاتے، ہر وقت خبر لیتے رہتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں، ہر آنے جانے والے سے اس کی خیریت دریافت کرتے ہیں، لیکن جب یہی اولاد گھر واپس آتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ ماں باپ کے پاس جاکر دعائیں لے، ان کے پاس جاکر ان کی خیریت دریافت کرے، وہ گھستے ہی اپنی ماں سے بدتمیزی سے بات کرتا ہے، اس کی آواز میں کرختگی ہوتی ہے، لہجہ میں کڑواہٹ ہوتی ہے، نرمی کے بجائے سختی ہوتی ہے، محبت کے بجائے نفرت جھلکتی ہے۔

یہ دو متضاد رویے ہیں، ایک رویہ والدین کا ہے قربانیوں سے بھرا، شفقتوں سے بھرا، محبتوں سے بھرا، جبکہ دوسرا رویہ اولاد کا ہے سختی کا، بے رحمی کا، بداخلاقی کا، بدتمیزی کا، بے ادبی کا، اکثر یہ چیز وہاں

دیکھنے کو ملتی ہے جہاں فرق ہو ماں باپ اور اولاد کے درمیان، چاہے وہ فرق مالی ہو یا علمی، اگر اولاد صاحب علم ہے، اس کا ایک مقام ہے، اس کی لوگ عزت کرتے ہیں، جہاں جاتا ہے علمی مجلسیں ہوتی ہیں، لوگ اس کے سامنے ادب سے بیٹھتے ہیں تو اس کو اپنے والدین سے ملنے میں یا ان کی خدمت کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، اگر اولاد مالدار ہے تو اس کو اپنے ماں باپ کی خدمت کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے، وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے شرماتا ہے، اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اگر اس نے اپنے باپ کا تعارف کرادیا تو لوگ کیا کہیں گے، احساس کمتری کا وہ شکار ہوجاتا ہے، جبکہ دوسری طرف اس کے ماں باپ اس کی زبان سے ڈرتے ہیں، اس کے سامنے بات کرنے سے ان کو ڈر ہوتا ہے، دوستوں کے سامنے اپنے بچوں سے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ کہیں بدتمیزی نہ کرے یا سخت لہجہ میں بات نہ کرے، طرح طرح کے خدشات ہوتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"إذا أطاع الرجل امرأته وعق أمه وأدنى صديقه وأقصى أباه" (قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ جب مرد بیوی کی اطاعت کرنے لگ جائے اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے اور جب دوست کو قریب کیا جانے لگے اور باپ کو دور کیا جانے لگے) (سنن ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "ملعون من عق والديه" (میزان الإعتدال) (ملعون ہے وہ شخص جس نے اپنے والدین کے ساتھ زیادتی کی۔)

حضور اکرم ﷺ نے ماؤں کی نافرمانی اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے سخت متنبہ کیا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن الله حرم عليكم عقوق الأمهات" (اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے۔) (متفق علیہ)

اولاد کو کسی طرح بھی ترقی ملتی ہے تو اس کے والدین ہی کو سب سے زیادہ خوشی ملتی ہے، ہر شخص مفاد سے جڑا ہوتا ہے لیکن والدین بنا کسی مفاد اور غرض کے اولاد سے وابستہ رہتے ہیں، کتنا احساس ہوتا ہوگا ان لوگوں کو جن کے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں، جو والدین کی شفقتوں اور ان کی محبتوں سے محروم ہو چکے ہیں، اب ان کو ایک ایک کر کے سب یاد آتا ہوگا، ان کی مشفقانہ ڈانٹ، ان کی محبانہ توجہات، ان کا باتیں کرنا، ان کا تعلق کا اظہار کرنا، والدین کے انتقال کے بعد سب ختم ہوجاتا ہے، اب وہ کس کے پاس جائے گا، کس کے پاس بیٹھے گا، کس کے سامنے اپنے دکھ درد کا اظہار کرے گا، کس کی گود میں سر رکھ کر روئے گا، کس سے مشورہ کرے گا، ایک ایک کر کے اس کو ان کی باتیں یاد آتی ہیں لیکن اب تو وہ جا چکے، اس کو افسوس ہوگا کہ جب وہ موجود تھے تب تو اس نے ان کی قدر نہیں کی، ان کی فکر نہیں کی، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں کیا۔

والدین کی زندگی میں ہی قدر ہونی چاہیے، ان کو وقت دینا چاہیے، ان کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے، ان کے ساتھ تواضع وانکساری سے پیش آنا چاہیے، آواز میں نرمی ہونی چاہیے، زبان میں مٹھاس ہونی چاہیے، ان کو یہ احساس ہو کہ میری اولاد میرے ساتھ حسن سلوک کرتی ہے، اپنی اولاد کا خیال آتے ہی ان کو فرحت وشادمانی ہو، وہ اولاد کے پاس ہوں تو ان کو لگے کہ ساری نعمتیں ان کو مل گئیں، ان کے ساتھ بے ادبی وبے توقیری نہ ہو، خاص کر عمر کی اس منزل میں جب وہ پہنچ جائیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے کہ ایک صحابی حضور ﷺ کے پاس آئے اور ان کے ساتھ ایک بوڑھے شخص تھے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: یہ صاحب کون ہیں؟ ان صحابی نے جواب دیا: میرے باپ، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

"فلا تمش أمامه، ولا تجلس قبله، ولا تدعه باسمه، ولا تستسب له" (المعجم الأوسط للطبرانی)

(ان کے آگے مت چلنا، مجلس میں ان سے پہلے مت بیٹھنا، ان کا نام لے کر نہ پکارنا، ان کی بے عزتی کا سبب نہ بننا۔)

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا طرز تدریس

محمد ارمغان بدایونی ندوی

’’مولاناؒ کا طرز تدریس فطری و وجدانی تھا، وہ خود لطف اندوز ہوتے اور ان کی لطف اندوزی اور وجدانی اہتزاز کا اثر غیر مرئی طور پر طلبہ پر پڑا کرتا۔‘‘ (مولانا عبداللہ عباس ندویؒ)

بیس سال کی عمر میں جب حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی باضابطہ و منظم تعلیم کی مدت ختم ہوئی اور گلستان علم کی خوشہ چینی کی صلاحیت پیدا ہوگئی تو آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بحیثیت مدرس وابستہ ہوگئے، ۱۵؍جولائی ۱۹۳۴ء کے جلسہ انتظامی میں مولانا مسعود علی صاحبؒ نے مولانا کے تقرری کی تجویز رکھی، جو علامہ سید سلیمان ندوی و دیگر اراکین کے اتفاق آراء سے الحمد للہ منظور ہوئی اور یکم اگست ۱۹۳۴ء کو بحیثیت استاد تفسیر و ادب ندوہ میں آپ کا تقرر ہوگیا۔

ندوہ کی آزادانہ فضا میں اور یہاں کے ماحول سے فکری و علمی ہم آہنگی کے سبب حضرت مولانا کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے اور ان کو ترقی دینے کے مواقع خوب فراہم ہوئے، آپ لکھتے ہیں:

’’یہاں تعلیم و تدریس کا فرض انجام دینے، طلبہ سے قریبی رابطہ رکھنے اور اگر کبھی ذہن میں آئے تو کوئی نیا تعلیمی تجربہ کرنے، بلکہ نصاب کے بارے میں بھی حقیر معروضات پیش کرنے اور مشورہ دینے میں کوئی انتظامی دقت اور دفتری اور حاکمانہ رکاوٹ حائل نہیں تھی۔‘‘

(کاروان زندگی: ۱/ ۱۴۵)

ابتداء میں آپ کو متوسط اور بعض عالی درجات میں تدریس کے لیے اہم کتابیں تفویض کی گئیں، قرآن، تاریخ اور عربی ادب حضرت مولاناؒ کا اختصاصی موضوع تھا، اسی لیے زیادہ مدت تدریس اسی دشت کی سیاحی میں گذری، اولاً آپ نے قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے، خضری کی ’’تاریخ الامم الاسلامیہ‘‘ کا پہلا حصہ اور حماسہ کا ”باب الأدب والنسیب والمراثی“ نیز احمد حسن زیات کی ’’تاریخ الادب العربی‘‘ پڑھائی اور ابتدائی درجات میں ’’القراءۃ الرشیدۃ‘‘ یا کامل کیلانی کی ’’حکایات الاطفال‘‘ کا کوئی حصہ بھی پڑھایا جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل تھا، علاوہ ازیں کسی درجہ میں منطق بھی ایک منفرد اسلوب میں پڑھائی، آپ رقمطراز ہیں:

’’جدید و قدیم منطقی اصطلاحات و اصول (مثلاً: دلالت مطابقی، دلالت تضمنی، دلالت التزامی) کی مثالیں روز مرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے دیتا تھا، اس میں ڈپٹی مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ’’مبادئ الحکمۃ‘‘ سے مدد اور رہنمائی ملی۔‘‘

(کاروان زندگی: ۱/ ۱۵۱-۱۵۲)

ان اہم مفوضہ کتب کی تدریس کے علاوہ اپنے ابتدائی زمانہ میں حضرت مولاناؒ نے حدیث کی امہاتِ کتب میں سے سنن ترمذی کا نصف ثانی بخوبی پڑھایا، پھر دارالعلوم سے تدریسی تعلق کے آخری سالوں میں صحیح بخاری کے بعض ابواب (مثلا: کتاب الوحی، کتاب الایمان اور کتاب العلم) بھی بڑی دل جمعی اور دل چسپی کے ساتھ پڑھائے، نیز ایک مختصر عرصہ تک ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ بھی پڑھائی۔

قرآن کا مجید کا وہ حصہ جو آپ کو سپرد تدریس کیا گیا تھا، زیادہ تر احکام اور کلامی و فقہی مباحث پر مشتمل تھا، حضرت مولاناؒ ان آیات کی تدریس کے لیے انتھک محنت و مطالعہ کرتے، آپ فرماتے ہیں:

’’کشاف، معالم التنزیل بغوی و مدارک تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں۔‘‘

(کاروان زندگی: ۱/ ۱۴۷)

قدیم تفاسیر کے علاوہ جدید تفسیروں میں ’’تفسیر المنار‘‘ اور مولانا آزاد کی ’’ترجمان القرآن‘‘ سے بھی بھرپور استفادہ کیا، ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ قرآن سے مدد لی اور طلبہ کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی ’’روح المعانی‘‘ بطور خاص زیر مطالعہ رہی نیز جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے استفادہ جاری رکھا۔

حضرت مولاناؒ دوران درس آیات کی تلاوت کے بعد ترجمہ کراتے اور اگر کسی آیت کی نحوی ترکیب طلبہ کے فہم سے بلند ہوتی تو بتادیتے، اسی طرح اگر کسی مشکل لفظ کی تشریح ضروری معلوم ہوتی یا کسی قرآنی لفظ کا کوئی خاص پس منظر ہوتا تو اسی قدر بیان کرتے جو مفید مطلب ہو، لیکن اس میں کبھی مدعیانہ لہجہ اختیار نہ فرماتے بلکہ جس

مفسر کی بات نقل کرتے تو حوالہ کے ساتھ کرتے، اس کے علاوہ ان کا سارا زور بقول مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ان حقائق پر ہوتا تھا:

''معمولی تشریحات کے علاوہ جس پر زور دیتے وہ قرآن کریم کا دائمی پیغام ہے جو ہر زمانہ، ہر جگہ کے لیے ہے اور آج بھی اس درجہ تازہ ہے اور حالات کے مطابق ہے جس طرح نزول کے وقت تھا اور جو واقعات امم سابقہ اور انبیائے سابقین کے بیان کیے گئے ہیں، وہ تصویر ہے انسانی عقل کے معارضہ کی جو انبیاء کرام کی دعوت کے مقابلہ میں ہمیشہ سامنے آتا رہا ہے اور جب بھی وہ دعوت اپنی صحیح روح کے ساتھ پیش کی جائے گی، وہی صورت پیش آئے گی۔''

(میر کارواں:۱۱۶)

حضرت مولاناؒ کے قرآن مجید کے طرز تدریس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ صاف نظر آتا ہے جن کی نظر قرآن کی عمومی تذکیر، اسرار وحکم اور آفاقی دعوت پر تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ طلبہ کے دل ودماغ میں قرآن مجید کی عظمت، اس کا جلال وجمال اور اس کی آفاقیت وہمہ گیری غیر مرئی طور پر نقش ہوجاتی تھی۔

حضرت مولاناؒ ندوہ کی آزادانہ فضا میں روایتی طرز تدریس کے بجائے اجتہاد سے کام لیتے تھے، اسی لیے آپ نے قرآن مجید کی بہترین تفہیم وتشریح کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا کہ جب طلبہ کی ذہنی استعداد پختہ ہوگئی تو انہیں براہ راست ترجمہ وتفسیر پڑھانے کے بجائے مضامین قرآن سے روشناس کرانے کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف موضوعات (مثلاً: توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ) پر قرآنی آیات جمع کرکے بیش قیمت محاضرے دیے جن سے فکر کی نئی راہیں کھلیں۔

جس زمانہ میں حضرت مولاناؒ نے ندوہ کی وادی تدریس میں قدم رکھا، اس وقت عربی زبان وادب، انشاء وخطابت کا ذوق عام تھا، نیز عالم اسلام کے متعدد مشہور ومعیاری عربی رسائل بھی ندوہ کی فضا میں غیر مانوس نام نہیں تھے، حضرت مولاناؒ کی ذہنی نشوونما بھی اسی باذوق ماحول میں ہوئی تھی اور ان کے نزدیک عربی زبان کی تعلیم اسی طریقہ کے مطابق مفید تھی جو طریقہ ان کے استاد شیخ تقی الدین ہلالی کا تھا، وہ زبان کی تعلیم میں کسی دوسری زبان سے مدد لینا اصولاً غلط تصور کرتے تھے، حضرت مولاناؒ نے بھی براہ راست عربی زبان کی تعلیم کو ندوہ میں خوب رواج دیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان میں طلاقت وروانی حاصل ہوئی اور عربی تحریر وتقریر میں طلبہ واساتذہ یکساں طور پر کہنہ مشق ہوگئے، کاروان زندگی میں حضرت مولاناؒ اپنے عربی ادب کے طرز تدریس کے متعلق خود رقم طراز ہیں:

''ضوابط وقواعد' نپے تلے وقت اور مقام کی کوئی قید نہ تھی، طلبہ کو ہر طرح مشق کرانے اور عربی سکھانے کا اہتمام رہتا تھا اور اس کے لیے ہم لوگ نئے نئے طریقے اختیار کرتے تھے اور ذہنی اپج سے کام لیتے تھے۔'' (کاروان زندگی:۱/۱۵۱)

عربی زبان وادب کی تدریس میں بھی حضرت مولاناؒ کا طرز تدریس منفرد اور اجتہادی تھا، جو از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھا، حضرت مولاناؒ کسی کتاب کی تدریس میں محض مصنف کی عبارت کے مقلد نہ تھے، بلکہ اس سے متعلق جو مزید جدید معلومات ہوتیں ان کو بھی بیان کرتے اور ادباء کے اسالیب کا باہمی فرق بھی بڑی شرح وبسط سے بیان فرماتے، اسی طرح کسی عربی لفظ کی تشریح میں اس کی تاریخ یا نسب نامہ نہ بتاتے بلکہ اس کے ادبی محاسن کو اچھی طرح دلنشیں کردیتے تھے، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی شہادت ہے:

''مولانا کا طرز یہ تھا کہ جو عبارت سامنے آگئی اس کے اندر عربیت کی جو روح ہوتی اس کو اس طرح اجاگر کرتے کہ پہلے اس کو ایک بار خود دہراتے جیسے کہ مصری کی ڈلی منہ میں پڑی ہے اور کام ودہن اس کی شیرینی سے حسی طور پر لطف اندوز ہورہے ہوں۔''

(میر کارواں:۱۰۴)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ نے انتہائی دل سوزی وجانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی اور طلبہ کی اخلاقی ودینی اصلاح وترقی کی کامیاب کوششیں کیں، تدریس سے مولانا کے اشتغال اور دلچسپی کی منھ بولتی تصویر انہی کے یہ الفاظ نذر قارئین ہیں:

''ذہین اور ذی استعداد اور سعادت مند طلبہ سے ایسا تعلق پیدا ہوجاتا تھا اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ایسی قلبی مسرت اور روحانی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ بڑی تعطیلات کے آنے پر بجائے خوشی کے رنج اور فکر پیدا ہوتی تھی اور ان کی جدائی کا صدمہ اور طویل خلا کا احساس تکلیف دیتا تھا۔'' (کاروان زندگی:۱/۲۲۸)

سازشوں کی کامیابی کی وجوہات

شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

’’میرا ذاتی ایمان یہ ہے کہ غیر مسلموں کی سازشیں امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے لیے کبھی بھی اس وقت تک بار آور نہیں ہوسکتیں جب تک خود امت مسلمہ کے اندر کوئی خامی یا نقص موجود نہ ہو، بیرونی سازش ہمیشہ اس وقت کامیاب ہوتی ہے اور ہمیشہ اس وقت تباہی کا سبب بنتی ہے جب ہمارے اندر کوئی نقص آجائے، ورنہ حضور اقدس ﷺ سے لے کر آج تک کوئی دور سازشوں سے خالی نہیں رہا، لہٰذا یہ سازش نہ کبھی ختم ہوئی ہے اور نہ کبھی ختم ہوسکتی ہے، یہ توقع رکھنا کہ سازشیں بند ہوجائیں گی، خود فریبی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ نقص اور خرابی اور خامی کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ سازشیں ہمارے خلاف کامیاب ہورہی ہیں؟ یہ سوچنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ آج جب ہم اپنی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہیں تو عموماً ہم سارا الزام اور ساری ذمہ داری ان سازشوں پر ڈالتے ہیں کہ یہ فلاں کی سازش سے ہورہا ہے، یہ فلاں کا بویا ہوا بیج ہے اور خود فارغ ہوکر بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خود ہمارے اندر کیا خرابیاں اور کیا خامیاں ہیں؟ اس سلسلہ میں دو بنیادی چیزوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

اس کا پہلا بڑا اہم سبب میری نظر میں یہ ہے کہ ہم نے اجتماع کو درست کرنے کی فکر میں فرد کو کھو دیا ہے اور اس فکر میں کہ ہم پورے معاشرہ کی اصلاح کریں گے، فرد کی اصلاح کو بھول گئے ہیں اور فرد کو بھولنے کے معنی یہ ہیں کہ فرد کو مسلمان بننے کے لیے جن تقاضوں کی ضرورت تھی، جس میں عبادات بھی داخل ہیں، جس میں تعلق مع اللہ بھی داخل ہے، جس میں اخلاق کا تزکیہ بھی داخل ہے اور جس میں ساری تعلیمات پر عمل بھی داخل ہے، وہ سب پیچھے جاچکے ہیں، لہٰذا جب تک ہم اس کی طرف واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے، اس وقت تک یہ تحریکیں اور ہماری یہ ساری کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ آج ہماری توجہ سیاست کی طرف بھی ہے، معیشت کی طرف بھی ہے، معاشرت کی طرف بھی ہے، لیکن فرد کی تعمیر کے لیے اور فرد کی اصلاح کے لیے ادارے نایاب ہیں، الا ماشاء اللہ، اسی وجہ سے آج ہماری تحریکیں کامیاب نہیں ہورہی ہیں، کسی نہ کسی مرحلہ پر جا کر ناکام ہوجاتی ہیں۔

دوسرا سبب میری نظر میں یہ ہے کہ اسلام کے تطبیقی پہلو پر ہمارا کام یا مفقود ہے یا کم از کم ناکافی ہے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے اجتماعیت پر اتنا زور دیا کہ عملاً اسی کو اسلام کا کل قرار دے دیا اور دوسری طرف اس پہلو پر کما حقہ غور نہیں کیا کہ آج کے دور میں اس کی تطبیق کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں نہ تو ہم نے کما حقہ غور کیا اور نہ اس کے لیے کوئی منضبط لائحہ عمل تیار کیا اور اگر کوئی لائحہ عمل تیار کیا تو وہ ناکافی تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ خدانہ کرے اسلام اس دور میں قابل عمل نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات کسی بشری ذہن کی پیداوار نہیں، یہ اس مالک الملک والملکوت کے احکام ہیں، جس کے علم وقدرت سے زمان ومکان کا کوئی حصہ خارج نہیں، لہٰذا جو شخص اسلام کو اس دور میں ناقابل عمل قرار دے، وہ دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کو اس دور میں برپا اور نافذ کرنے کے لیے کوئی طریق کار اختیار کرنا ہوگا، اس طریق کار کے بارے میں سنجیدہ تحقیق اور حقیقت پسندانہ غور وفکر اور تحقیق کی کمی ہے۔‘‘

(اصلاحی خطبات: ۶/ ۲۵۷-۲۶۹)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 15 ✦ February 2023 ✦ Issue: 02

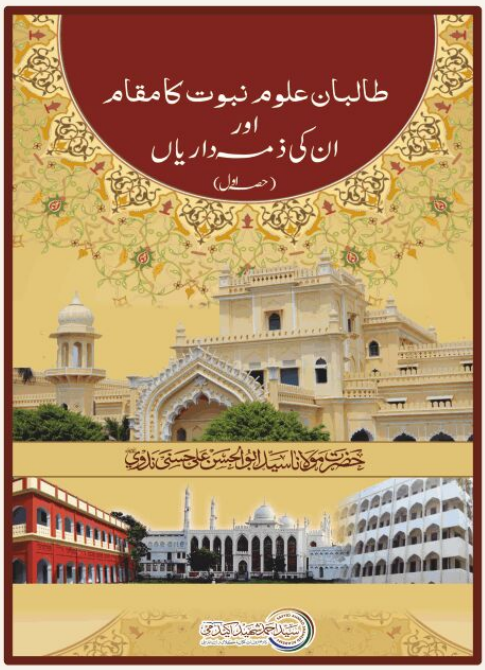

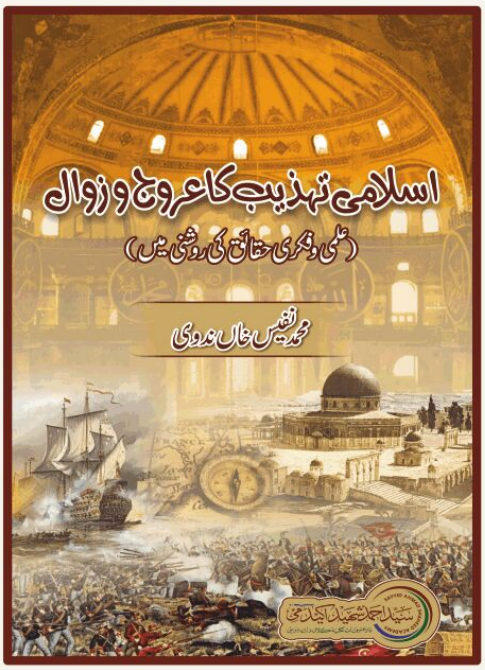

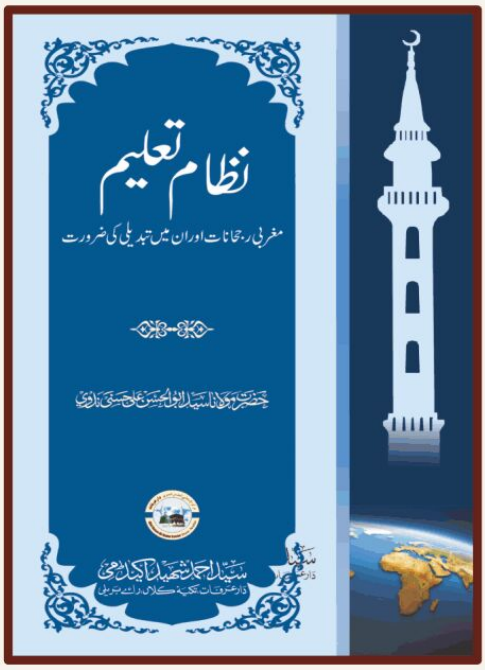

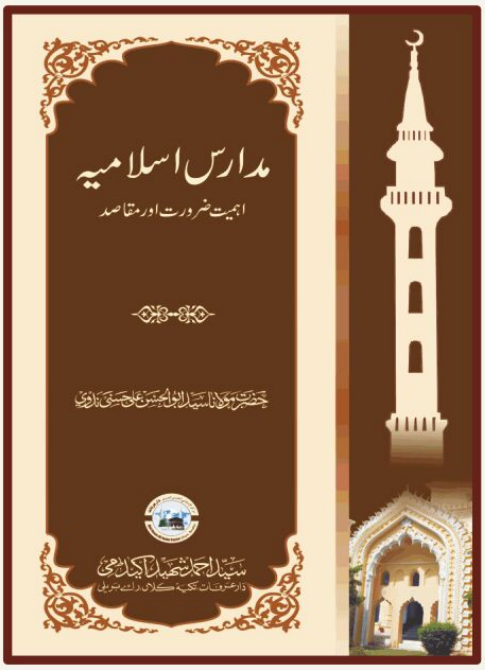

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: **9792646858**
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)